OPEN ACCESS
Al-Nasr
ISSN (Online): 2958-9398
ISSN (Print): 2959-1015
https://alnasrjournal.com

فصاحتِ قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا تنقیدی جائزہ

A Critical Analysis of the Orientalists' Objections to the Eloquence of the Quran

Naveed Ahmad

Doctoral Candidate, Department of Hadith, Islamia University of Bahawalpur

Na.bashaar@gmail.com

Dr. Abdul Rahman

Lecturer, Department of Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat Pakistan

onlyimran2010@gmail.com

Abstract

The Qur'an is the unobtrusive book of Allaah, the last Prophet Muhammad is a miracle that remains till the Day of Resurrection, some of the aspects of different aspects have objected to it. On the other hand, the researchers have given their reputations, such a thing is used in the Arabic words that the words are used in the Holy Qur'an. In the case of the Qur'an, the essence of the Qur'an is essential, and it is ignorant to say it the Divine Word. From a research point of view, it is known that in the third Hijri, this objection was first made by Abu al -Hussein Ahmad ibn Yahya Rawandi (M: 295 H). Later! The names also raised the objection, which includes the names of GotTheld Bergsträsser, Theodor

CC BY

NöLDEKE and Friedrich Schwally. Similarly, Theodor NöLDEKE and Friedrich Schwally have made similar claims in the book "History of the Holy Quran". What is the truth of these claims now? What are the answers to these objections?

Keywords: Eloquent Qur'an, commentators and critical reviews

تمہید

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی لاریب کتاب ہے، آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت تک کے لیے باقی رہنے والا معجزہ ہے، مختلف پہلوؤں سے بعض الناس نے اس پر اعتراضات کیے، دوسری طرف محققین نے ان کے مسکت جوابات دیے ہیں، ایسے ہی ایک اعتراض قرآن مجید پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں غیر عربی الفاظ کی آمیزش ہے اور لغات قدیمہ کے ایسے الفاظ اس میں داخل کر دیے گئے ہیں جو اہل عرب کے ہاں استعمال نہیں ہوتے۔ بدیں صورت قرآن کی فصاحت پر لازمی حرف آتا ہے اور یوں اسے کلام الٰہی کہنا بے ادبی ہے۔ تحقیقی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیسری ہجری میں یہ اعتراض سب سے پہلے ابو الحسین احمد بن یحییٰ راوندی (م:295ھ) نے کیا تھا۔ بعد ازاں! مستشرقین نے بھی اس اعتراض کو اٹھایا، جن میں Gotthelf Bergsträsser، Theodor Nöldeke اور Friedrich Schwally کے نام زیادہ اہم ہیں۔ مستشرق Bergsträsser نے اپنی کتاب "التطور النحوی" میں دعوی کیا ہے کہ قرآن میں فارسی، حبشی، یونانی اور لاطینی زبان کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں جو کہ اصل عربی زبان کے الفاظ نہیں۔ اسی طرح Theodor Nöldeke اور Friedrich Schwally نے "تاریخ القرآن" نامی کتاب میں ایسے ہی دعوے کیے ہیں۔ اب ان دعوؤں کی کیا حقیقت ہے؟ ان اعتراضات کے جوابات کیا ہیں؟، ان بنیادی سوالات کے جوابات ذیل کی تحقیق میں دیے جارہے ہیں۔

قرآن کریم بلاشبہ عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے، عربی گرائمر کے لیے بھی ایک مصدر و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کریم خالص عربی زبان میں نازل ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ[1]}

ترجمہ: بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ[2]}

ترجمہ: اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ بے شک وہ کہتے ہیں اسے تو ایک آدمی ہی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان، جس کی طرف وہ غلط نسبت کر رہے ہیں، عجمی ہے اور یہ واضح عربی زبان ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قرآن تو ایسی صاف عربی زبان میں ہے جو فصاحت وبلاغت اور اعجاز بیان میں بے نظیر ہے۔"[3]

ان واضح حقائق کے برعکس مستشرقین کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں بعض ایسے الفاظ داخل ہو گئے ہیں جو اصل میں عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں، ایسا دعویٰ کرنے والے صرف وہ لوگ ہیں جو یا تو عربوں کی تاریخ سے ناواقف ہیں، یا حسد و عناد کی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں، لیکن مستشرقین کے ہاں اس دعویٰ کے پیچھے جو بنیادی مصدر ہے وہ بنی اسرائیلی علاقوں کے سفر نامے ہیں۔ لوگوں کی زبانی انہوں نے ان اسفار میں جو کچھ سنا، اسے حرف آخر سمجھ لیا، نیز انہوں نے عربی زبان کو صرف اسلام کی نظر سے دیکھا ہے اور اس پر اعتراض کو وہ دین اسلام پر اعتراض سمجھتے ہیں، حالانکہ قبل از اسلام بھی عربی زبان کی ایک تاریخ ہے، اس کے الفاظ کی تفصیلات جاننے کے لیے ڈکشنری موجود ہیں، لیکن تحقیق کا خون کرتے ہوئے مستشرقین ان سے صرف وہ باتیں لیتے ہیں، جن سے کوئی تنقید کا پہلو نکلتا ہو۔

فصاحت قرآن پر مستشرقین نے جو اعتراضات کیے ہیں، اس کا درج ذیل ہے:

قرآن مجید میں بعض قدیم زبانوں کے الفاظ داخل کر لیے گئے ہیں، جو حقیقت میں عربی الاصل نہیں ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قدیم زبانوں سے الفاظ کو مستعار لے کر قرآن میں شامل کر لیا ہے۔

ہم اپنی اس تحقیق میں اس اعتراض کا دو زاویوں سے جائزہ لیں گے:

1 اس بات کی تحقیق مطلوب ہے کہ عربی زبان سابق ہے یا مسبوق؟

2 جن بعض الفاظ کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ غیر عربی الفاظ ہیں تو ان کے بارے میں واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ الفاظ عربی الاصل ہیں مگر بعد کچھ تبدیلی کے ساتھ عجمی زبانوں میں استعمال ہونے لگے۔

مستشرقین کے حوالے سے اس باب میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جن مستشرقین کے مشرق کی ثقافت و حضارت پر تحقیق کی ہے، اس کی ان کی تین اقسام ہیں:

1 بعض مستشرقین آزاد خیال ہیں، وہ کسی تعصب کا شکار نہیں ہیں، وہ اس تحقیق میں لازمی طور پر بعض درست تحقیق بھی کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنی ناقص معلومات کے سبب غلطی کر جاتے ہیں۔

2 دوسرے وہ مستشرقین ہیں جو مذہبی تعصب کا شکار ہیں، ان کا اس باب میں زیادہ تر اعتماد بنی اسرائیل کی تاریخ پر ہے اور اس کے عہد قدیم کو دیکھتے ہیں، اس میں جو کچھ ہے، اسے حق سمجھتے ہیں اور جو اس کے علاوہ ہے، اسے باطل قرار دیتے ہیں۔

3 تیسرا وہ عیسائی متعصب مستشرق ہے جو قدیم یہودی اسفار کی تاریخ کے ساتھ جدید سفر ناموں کو پڑھتا ہے، اس میں قوموں کی جو تفصیلات موجود ہوتی ہیں، ان سے اپنے مطلب کی بات اخذ کر لیتا ہے۔

متعصب مستشرق کی تحقیق کا اس باب میں محور و مرکز یہی ہے کہ عربوں کی ہر حوالے سے فضیلت ختم کی جائے اور عربی زبان چونکہ اسلامی مصادر کی بنیادی زبان ہے تو وہ اس تعصب میں آکر عربی زبان کی شاندار اور تابناک تاریخ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر پائے۔

ا عربی زبان سابق ہے یا مسبوق؟

مستشرقین نے قرآن مجید پر ایک بڑا اعتراض یہی کیا ہے کہ اس میں بعض قدیم زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں؟ اب یہاں اس بات کی تحقیق لازمی ہے کہ دنیا کی زبانوں میں قدیم ترین زبان کون سی ہے؟ اور کیا اکثر معروف زبانیں عربی زبان سے پہلے کی ہیں؟

عربی زبان ہی سابق ہے نہ کہ مسبوق، اس کے لیے درج ذیل دلائل پر غور کیا جا سکتا ہے:

1 امام ترمذی نے ایک روایت بایں الفاظ نقل کرتے ہیں:

"عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لما خلق الله آدم ونفخ فيه الروح عطس فقال: الحمد لله، فحمد الله بإذنه، فقال له ربه: رحمك الله يا آدم، اذهب إلى أولئك الملائكة، إلى ملإ منهم جلوس، فقل: السلام عليكم، قالوا: وعليك السلام ورحمة الله، ثم رجع إلى ربه، فقال: إن هذه تحيتك وتحية بنيك، بينهم۔"[4]

ترجمہ: ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ نے آدمؑ کو پیدا کیا اور ان میں روح پھونک دی، تو ان کو چھینک آئی، انہوں نے الحمدُ للہ کہنا چاہا چنانچہ اللہ کی اجازت سے **الحمدُ للہ** کہا، (تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں) پھر ان سے ان کے رب نے کہا: اللہ تم پر رحم فرمائے۔ اے آدم! ان فرشتوں کی بیٹھی ہوئی جماعت و گروہ کے پاس جاؤ اور ان سے السلام علیکم کہو، انہوں نے جا کر السلام علیکم کیا، فرشتوں نے جواب دیا، وعلیک السلام ورحمۃ اللہ، پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹ آئے، اللہ نے فرمایا: یہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا آپس میں طریقہ سلام ودعا ہے۔

اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "السلام علیکم" کے الفاظ کو میل جول کے وقت بولے جاتے ہیں، یہ آدم علیہ السلام نے بولے اور اس وقت یہ چلے آرہے ہیں۔ مسلمانوں میں آج بھی یہی الفاظ من وعن رائج العمل ہیں۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی یہ الفاظ اسی طرح منقول ہیں۔ یہودی بھی آج تک یہی کہتے ہیں، البتہ ان میں بعض "سلام" کے بجائے "شالوم" کہتے ہیں، گویا کہ ان میں بعض نے سین کو صرف شین سے بدل دیا ہے۔ دائرہ المعارف الکتابیہ میں "سلام اور سلامہ" کے مادہ میں لکھا ہے کہ شالوم سے مراد سلام ہی ہے، جسے دوست ملاقات اور خیریت معلوم کرنے کے وقت ایک دوسرے کو بولتے ہیں، اسی طرح الوداع ہوتے بھی یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔[5]

اب سوال یہ ہے کہ "السلام علیکم" کا جو نطق ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام نے کیا، بالکل انہی الفاظ کو آگے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کیا ہے تو پھر اس پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان "عربی" کیا ابتدائی کہاں سے ہوئی ہے؟

2 ابو البشر حضرت آدم کا نام بھی عربی الاصل ہے، جو کہ "الادمۃ" سے مشتق ہے، جس کا معنی مٹیالے رنگ کے ہیں، کیونکہ حضرت آدم کو بھی مٹی سے بنایا گیا اور اس میں زرد، سرخ اور سفید تینوں رنگ کی مٹی جمع کی گئی جس کے سبب حضرت آدم کا رنگ مٹیالہ تھا۔ حضرت آدم کا یہ نام سب شریعتوں میں متفقہ ہے۔

اب سوال ہے کہ "آدم" نام کی پوری تفصیل لغت عرب میں موجود ہے تو پھر اس کی تاریخ اور ابتدا کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ عربی زبان سابق ہے یا مسبوق؟ اس لیے اصل حقیقت یہ ہے کہ اس زمین پر سب پہلی بولی جانے والی زبان عربی ہے، بعد ازاں! مختلف زبانیں وجود میں آئیں اور پھر ان میں عربی میں بعض الفاظ داخل ہو گئے۔

3 اشرف الملائکہ حضرت جبرائیل کا نام بھی عربی الاصل ہے، اس کے کئی ایک نطق ہیں، جن میں جبریل اور جبرئل بھی ہیں۔ یہ نام دو مقطعوں کا مجموعہ ہے: "جبر" اور "ئیل"۔ جبر کے معنی قوت اور شدت کے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت جبرائیل کے اوصاف میں شدید القوی[6] اور ذو قوۃ[7] بھی بیان ہوئے ہیں۔ اسی ئیل اور ئل دونوں عربی زبان میں مستعمل ہیں، اگرچہ اہل حجاز کے ہاں اس کا استعمال کم کم ہے، لیکن ان کے علاوہ دوسرے عربوں کے اس کا استعمال باقاعدہ طور پر موجود ہے۔ ابن درید لغوی کہتے ہیں:

"وقال ابن الكلبي: كل اسم في العرب آخره إل أو إيل فهو مضاف إلى الله عز وجل نحو شرحبيل وعبد ياليل وشراحيل وشهميل وما أشبه هذا۔"[8]

ترجمہ: ابن کلبی کہتے ہیں کہ عربوں کے ہاں اصول یہ ہے کہ ہر وہ نام جس کے آخر میں ال یا ایل ہو گا تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی، جیسا کہ شرحبیل، عبدیالیل، شراحیل، شہمیل اور ان جیسے دیگر نام ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ جبرائیل بھی عربی الاصل نام ہے تو اب اس کی ابتدا اور تاریخ اچھی طرح واضح ہو گئی ہے۔

4 حضرت نوح کے دور تک بھی عربی زبان بولے جانے کے شواہد ملتے ہیں، قرآن مجید میں آتا ہے:

{وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا}[9]

ترجمہ: اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔

اس آیت میں مذکور نیک بزرگوں کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سب عربی الاَصل ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک بھی عربی زبان بولے جانے کے آثار موجود ہیں، حالانکہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے مابین کئی صدیوں کا فاصلہ ہے، جیسا کہ مفسر قرآن سیدنا عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں:

"كان بين نوح وآدم عشرة قرون"[10]

ترجمہ: حضرت نوح اور حضرت آدم کے مابین دس صدیوں کا فاصلہ تھا۔

مذکورہ دلائل سے درج ذیل باتیں واضح ہو چکی ہیں:

1 حضرت آدم نے فرشتوں کے ساتھ سب سے پہلے جس زبان میں گفتگو کی وہ عربی زبان تھی، یوں عربی زبان کا الہامی زبان ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے اور یہ اس کی عظمت کو باقی زبانوں پر ثابت کر دیتی ہے۔

2 حضرت آدم کی زبان جب عربی تھی تو لازمی طور پر وہ اسی زبان کو لے کر زبان پر اترے، ایک وقت تک ان کی اولاد بھی یہی زبان رہی، بعد میں ان کی بعد جب ایک دوسرے سے دور جا بسی تو پھر ایک عرصہ بعد لازمی زبان میں فرق آ گیا۔

3 عربی زبان منزل من اللہ ہے اور اس کے مقابلے میں باقی زبانیں لوگوں کے مختلف لہجات کے بعد وجود میں آئی ہیں۔

4 حضرت نوح علیہ السلام کے دور تک عربی زبان بولے جانے کے آثار ملتے ہیں۔

۲ بعض عربی الاصل الفاظ جن کی نسبت عجمی زبان کی طرف کی جاتی ہے

در حقیقت جب عرب لوگ مختلف علاقوں کی ہجرت کر گئے اور ان کے درمیان دوری ہو گئی۔ عراق، شام، مصر اور جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے تو ان زمانہ گزر جانے کے بعد مخارج اور لہجات میں فرق آ گیا تو ایک ہی لفظ کو مختلف عرب اپنے مختلف لہجے اور مخرج کے ساتھ ادا کرنے لگے۔

5200 قبل مسیح یا 1500 قبل مسیح جو قومیں شام، فلسطین، عراق، عبر، فنیشیہ اور مصر میں آباد تھیں، ان کی ثقافت، زبان اور معاشرت میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے، اسی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ یہ تمام اقوام جو بابلی، آسوری، کلدی، آموری، عبیری، عربی اور مصری کی نسیبتیں رکھتی ہیں، سب کی سب سام کی نسل سے تھیں اور سام حضرت نوح کے بیٹے تھے۔ اوپر ہم واضح کر چکے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور تک عربی زبان بولے جانے کے شواہد موجود ہیں۔ اب ایک سوال ضرور ہے کہ سامی نسل کا اصل وطن کہاں تھا، ماہرین اس بارے میں مختلف آرا رکھتے ہیں، ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ شمالی افریقہ سے پھیلے، دوسرا گروہ جو عہد نامہ عتیق سے متاثر ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان کا اصل وطن دجلہ و فرات کی وادیاں ہیں، یہ صرف قیاس آرائیاں ہیں، کیونکہ اس دعووں کو قبول کیا جائے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرے نے زرعی زندگی اختیار کرنے کے بعد بدوی زندگی کو اختیار کر لیا تھا، یہ طور طریقہ قانونِ ارتقا کے بالکل برعکس ہے۔ اسی لیے مؤرخین یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ بابلی، شامی، مصری، عراقی اور فنیقی سب عربی النسل تھے جو بعد میں مختلف علاقوں میں منقسم ہو گئے۔

History Of The Arabs میں لکھا ہے:

"سامی تہذیب کا گہوارہ یہی خطہ عربی تھا، اسی نے ان سپوتوں کو پروان چڑھایا جو ترک وطن کر کے ان مختلف علاقوں میں آ کر آباد ہو گئے، بعد میں یہی لوگ فنیقی، شامی اور بابلی کہلائے، یہی لوگ تاریخ کے عبراتی لوگ ہیں، سامی تہذیب کی اسی سرزمین سے یہودیت کے آثار نمایاں ہوئے، یہیں عیسائیت پروان چڑھی، اسی ریگزار سے ایک نیا مذہب اسلام ابھرا۔"[11]

مولانا سلیمان ندوی نے بھی تاریخ ارض القرآن میں لکھا ہے:

"جب سامی نسل عرب کے ریگزاروں سے نکلی ہو گی تو وہی زبان لے کر نکلی ہو گی جو اس دور میں عرب میں بولی جاتی تھی، بعد کے ادوار میں ان زبانوں میں تبدیلی آتی گئی اور یہ زبان آرامی کہلائی۔"[12]

مولانا ندوی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ عربی ایک قدیم ترین زبان ہے، حقیقت میں عرب لوگ جب مختلف علاقوں میں منقسم ہو گئے، تب ان کی زبان اور لہجات میں فرق آ گیا اور ایک طویل زمانہ کے بعد وہ فرق اس قدر بڑھ گئے کہ مستقل زبانیں وجود میں آ گئیں، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی، آرامی، کلدائی اور ہندی وغیرہ میں عربی کے الفاظ موجود ہیں۔

تحقیق کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ قومیں عرب سے نکل گئیں اور جنہیں بیرونی اقوام سے سابقہ پڑا، ان کی زبانیں آہستہ آہستہ بیرونی اثرات کے تحت تبدل و تغیر کا شکار ہو گئیں، لیکن وہ لوگ جنہوں نے عرب میں ہی بود و باش رکھی، ان کی زبان بیرونی اثرات سے محفوظ رہی، گویا انہوں نے اصل سامی زبان یا آرامی زبان کو تغیر و تبدل سے محفوظ رکھا، لہٰذا ایک ہی اصل زبان میں اگر الفاظ مشترک ملتے ہیں تو اس میں حیرت کی بات کیا ہے؟؟

لیکن مغربی محققین کو جب ہم اس بحث میں پڑھتے ہیں تو وہ اس بات پر مصر ہیں کہ عربی زبان میں بعض عجمی الفاظ داخل ہو گئے ہیں، حالانکہ اس کے برعکس اگر یہ دعویٰ کر لیا جائے کہ یہ سارے الفاظ اصلاً عربی ہیں، جنہیں حبشی، آرامی، سریانی اور عبرانی زبانوں سے مستعار لیا گیا ہے تو بعد از قیاس نہیں ہو گا۔

بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ الفاظ سے پہلے ان کے اصطلاحی معنی اور مطالب اخذ کیے گئے اور چونکہ ان کے لیے متبادل الفاظ میسر نہ تھے، اس لیے انہیں الفاظ کو قائم رکھا گیا، لیکن اگر عربی لغات اور عبرانی لغات کا موازنہ کیا جائے تو روزمرہ کے استعمال اور بنیادی ضروریات کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ مشترک پائے جاتے ہیں، مثلا: اب، ارض، اسیر اور امر وغیرہ

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کے اور ان جیسے دیگر الفاظ کے مشترک ہونے کے معنی یہ لیے جا سکتے ہیں کہ عربوں کو ان بنیادی الفاظ کے لیے عبرانی زبان سے منت سماجت کرنا پڑی، ان الفاظ کے متوازی الفاظ عربی میں موجود نہ تھے، یا یہ کہ چونکہ یہ الفاظ عبرانی زبان سے لیے گئے، اس لیے ان الفاظ سے متعلق معنی اور تصور بھی مستعار لیا گیا، اگر ایسا نہیں تو پھر ایک شاخ کی دو زبانیں اگر مشترک الفاظ رکھتی ہیں تو اس میں اعتراض کرنے والی آخر کیا بات ہے؟

اس ساری بحث کا خلاصہ کیا جائے تو حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے جن الفاظ کے بارے میں دعویٰ کیا جائے کہ وہ عجمی ہیں، ایسے الفاظ کو ہم تین مراتب میں تقسیم کر سکتے ہیں:

مرتبہ اولیٰ: جب سے لفظ کا نطق کیا گیا ہے، تب سے اس میں کوئی تغیر نہیں آیا، شروع سے آج تک وہ اسی طرح بولا جا رہا ہے، جیسا کہ لفظ جلالہ "اللہ" ہے، اس لفظ کے تلفظ میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

مرتبہ ثانیہ: الفاظ میں صوتی لحاظ سے ایسی تبدیلی واقع ہو گئی جس نے ان الفاظ کو اصل اشتقاق سے خارج کر دیا، جیسا کہ ابراہیم، اسحاق، اسماعیل اور داود ہیں۔ ان الفاظ کی اصل سے متعلق بحث کو ایک طرف رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ باتفاق علمائے لغت یہ الفاظ عجمی ہیں۔

مرتبہ ثالثہ: جب اقوام ایک دوسرے سے ہجرت کر کے دوری اختیار کر گئیں اور بعض ایسے الفاظ معرض وجود میں آئے کہ حوادث زمانہ کے باعث ان کی لغت بدل گئی، عربی اشتقاق سے وہ لفظ دور چلا گیا، مدلول میں تغیر واقع ہو گیا، لفظ کے حروف کی تعداد میں فرق آ گیا۔ ایسی جدید اشیا سامنے آئیں، جو غیر عرب علاقوں کی پیداوار تھیں اور وہاں ان کے ایسے نام رکھے گئے جو عربوں میں مستعمل نہ تھے، مثلاً: تلفون، میکروب، فیروس، یہ وہ الفاظ ہیں جو اصلاً انگلش زبان کے ہیں، مگر تھوڑے بہت تغیر کے بعد ان کو عربی زبان میں داخل کر گیا ہے، انہی کو دخیل کہا جاتا ہے۔

اب اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ قرآن مجید میں بعض عجمی الفاظ داخل ہیں تو ان کی دو طرح سے صورتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی صورت: بعض وہ الفاظ جن کے عجمی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ اقوام اور شخصیات کے نام ہیں تو ظاہر بات ہے کہ انہیں بالکل اسی طرح قرآن مجید میں نقل کر دیا گیا ہے، اس سے قرآن مجید پر فصاحت پر آخر کیوں حرف آئے گا، یہ تو طبعی امر ہے کہ آخر زبان میں کسی قوم یا شخصیت کا جو نام ہو گا تو جب کسی دوسری زبان کے اس کا تذکرہ کریں گے تو لازمی طور پر قوم یا شخصیت کا نام تو تبدیل نہیں کریں گے۔

دوسری صورت: اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جن ناموں کے بارے میں عجمی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، حقیقت میں وہ عربی الاصل ہی ہیں، ایک زمانہ گزر جانے کے بعد ان میں صوتی یا کسی تحریری لحاظ سے کچھ تغیر واقع ہو گیا تھا۔

اہل علم کی بڑی جماعت کا یہی دعویٰ ہے قرآن مجید کے جن الفاظ سے متعلق عجمی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ حقیقت میں عربی الاصل ہیں، اسی سے مستعار لے کر کچھ تغیر کے بعد دوسری زبانوں میں استعمال ہونے لگ ہیں، چند الفاظ کی تحلیل اس حوالے سے درج ذیل ہے:

(ا) اسماعیل

اس کی اصل "یسمع ایل" اس کا اصل مادہ "سمع" ہے اور ایل کا اطلاق لفظ "اللہ" کے لیے ہوتا ہے تو گویا یہ اصل میں "یسمع اللہ" تھا اور یہ ترکیب عربی زبان میں آج تک مستعمل ہے۔ مگر ایک زمانہ کے بعد اس لفظ میں تغیر لا کر اسماعیل بنالیا گیا۔

(ب) اسحاق

اسحاق کا عربی زبان میں معنیٰ "یصحک" (وہ ایک مرد ہنستا ہے یا ہنسے گا) ہے۔ یصحک لفظ کی وہ مکمل تعلیل جس کے بعد یہ اسحاق بنا، کتابوں میں قواعد وضوابط کے ساتھ موجود ہے۔ ڈاکٹر مساعد الطیار نے اس پر لمبی چوڑی بحث کی ہے۔

(ج) یعقوب

یعقوب وزن(یفعول) عربی زبان میں موجود ہے، جیسا کہ یعفور اور یعسور کے الفاظ عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ عقب سے ماخوذ ہے اور یہ عاقب کے معنیٰ (کسی کے پیچھے آنے والا) میں ہے، حقیقت میں جب حضرت ابراہیم کو اسحاق کی خوشخبری سنائی گئی تھی تو بتایا گیا تھا کہ ہم آپ کو اسحاق بیٹے اور ان کے بعد آنے والے پوتے یعقوب کی خوشخبری سنا رہے ہیں۔
یہ سارے شواہد ثابت کرتے ہیں کہ قرآن مجید ایک فصیح وبلیغ کلام والی کتاب ہے، اس میں کوئی بھی دخیل لفظ نہیں ہے۔ جمہور علمائے کرام کی اسی لیے رائے ہے کہ قرآن مجید میں کوئی لفظ غیر عربی نہیں ہے اور قرآن مجید خالص عربی اسلوب رکھتا ہے۔
جیسا کہ امام قرطبی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"لا خلاف بين الأئمة أنه ليس في القرآن كلام مركب على أساليب غير العرب"[13]

ترجمہ: ائمہ کرام کا بلا اختلاف یہ کہنا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسا کلام نہیں ہے جو غیر عربی اسلوب کی ترکیب رکھتا ہو۔

حافظ جلال الدین سیوطی اس حوالے سے کہتے ہیں:

"واختلفوا اهل وقع فيه غيرها، فلاكثرو منهم الشافعي وابن جرير انكروا ذلك"[14]

ترجمہ: قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ میں مستعمل ہونے سے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے، البتہ اکثر علمائے کرام جن میں امام شافعی اور امام ابن جریر جیسے بلند پایہ نام ہیں، وہ قرآن میں غیر عربی الفاظ کے موجود ہونے کا رد کرتے ہیں۔

اسی طرح امام قرطبی فرماتے ہیں:

"فذهب القاضي أبو بكر بن الطيب والطبري وغيرهما إلى أن ذلك لا يوجد فيه، وأن القرآن عربي صريح، وما وجد فيه من الألفاظ التي تنسب إلى سائر اللغات إنما اتفق فيها أن تواردت اللغات عليها فتكلمت بها العرب والفرس والحبشة وغيرهم۔"[15]

ترجمہ: قرآن مجید کے بارے میں قاضی ابو بکر بن طیب اور امام ابن جریر طبری کا نکتہ نظر یہ ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ نہیں ہیں، قرآن صریح عربی کلام کا مجموعہ ہے، البتہ وہ الفاظ جن کی نسبت غیر عربی لغات کی طرف کی جاتی ہے تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں عربی، فارسی اور حبشی وغیرہ متفق و مشترک ہیں۔(یعنی وہ الفاظ کسی ایک زبان کا امتیاز یا خاصہ نہیں ہیں)

ڈاکٹر حافظ زبیر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"بیگش ٹراسا، تھیڈونولڈیکے، آرتھر جیفری اور جوزف شاخت وغیرہ کا خیال ہے کہ قرآن میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو غیر عربی ہیں یا دوسری زبانوں مثلاً فارسی، حبشی، آرامی، یونانی اور لاطینی وغیرہ سے مستعار ہیں۔ گاٹ ہیلف نے رمان، سوق، زیت، سبیل، خمر، کتاب، مرجان، تفسیر، باب، زجاج، رحمان، قیوم، سکین، خاتم، فرقان، سلطان، عالم، صلی، صام، زکاۃ، عبد، کفر، تاب وغیرہ کو آرامی سے مستعار قرار دیا ہے۔65 اسی طرح نولڈیکے کا خیال ہے کہ قرآنی اصطلاح 'نبی' عبرانی، 'دین' فارسی اور 'ملۃ' آرامی زبانوں سے ماخوذ ہیں66۔ علاوہ ازیں اس نے اُمی، اَساطیر، فرقان، نسخ، منافق، الرحمن، مثانی وغیرہ کو بھی غیر عربی الفاظ قرار دیا ہے۔ ایسی تحقیقات سے مستشرقین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف غیر عربی زبانیں سیکھا کرتے تھے بلکہ ان سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ درست بات تو یہ ہے کہ آرامی (Aramic) بھی عربی زبان کا ایک لہجہ (dialect) ہی ہے جو ناپید ہو چکا ہے۔"[16]

ایک ضروری سوال:

قرآن مجید عربی زبان کا شاہکار ہے، اللہ تعالیٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس جیسی فصیح و بلیغ کوئی انسان نہیں لا سکتا، اہل مکہ جو مسلمانوں کے حوالے سے دشمن تھے، انہوں نے قرآن مجید پر اعتراضات کیے کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے، منزل من اللہ نہیں ہے۔ وہ عربی زبان کے ماہر ادیب تھے۔ شاعری کا ذوق وشوق ان میں بہت نمایاں تھے، مگر تاریخ میں اہل عرب کی طرف سے ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ انہوں نے کبھی قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کا اعتراض کیا ہو، بلکہ وہ اس کلام کی فصاحت وبلاغت کے سحر میں اس قدر مبتلا ہوئے کہ یہ کہنے پر مجبور مجبور ہوگئے کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے۔ اب وہ مستشرقین جن کی عربی مادری زبان نہیں، وہ اس کی لغوی گہرائیوں سے بھی واقف نہیں، وہ کیونکر اس کی فصاحت کا اعتراض کر سکتے ہیں، لیکن حقائق بتاتے ہیں کہ اسلام کے بغض میں وہ ہر طرح کی ناکام ونامراد کوشش سے باز نہیں رہتے۔

بحث کا خلاصہ

قرآن مجید اپنی عربی دانی کے لحاظ سے ایک فصیح و بلیغ کتاب ہے، مستشرقین نے اس حوالے سے اعتراضات اٹھائے ہیں کہ قرآن مجید میں بعض الفاظ دوسری قدیم زبانوں کے شامل ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے، حالانکہ عربی ایک قدیم ترین زبان ہے اور یہ ام اللغات کا مقام رکھتی ہے، اس کے الفاظ کئی ایک زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ عرب جب مختلف علاقوں میں پھیلے اور دوسری اقوام کے ساتھ ان کے رروبط بڑھے تو بعض عربوں کے لہجات میں ضرور فرق آ گیا، مگر قرآن مجید اس سے متاثر نہیں ہوا، وہ وحی الہٰی اور منزل من اللہ کتاب ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات اس حوالے سے باطل ہیں۔

حوالاجات

[1] یوسف:12/2

[2] النحل:16/103

[3] یوسف، صلاح الدین، حافظ۔ تفسیر احسن البیان، ص:368۔ دار السلام، ریاض، سعودی عرب

[4] ترمذی، محمد بن عیسیٰ، امام۔ جامع الترمذی:5/453، رقم:3368، ت: احمد شاکر، فواد عبد الباقی۔ مکتبہ مصطفی الحلبی، مصر۔ ط:2، 1975ء

[5] ولیم وھبہ بباوی۔ دائرۃ المعارف الکتابیہ:14/419۔ دار الثقافہ

[6] النجم:5

[7] تکویر:20

[8] ابن درید، محمد بن حسن، ازدی، علامہ۔ جمھرہ اللغۃ:1/59۔ دار العلم للملایین، بیروت، لبنان۔ ط:1987ء

[9] نوح:71/23

[10] طبری، محمد بن جریر، ابو جعفر، امام۔ جامع البیان فی تاویل القرآن:4/275۔ مؤسسۃ الرسالہ۔ ط: اولیٰ، 2000ء

[11] Phillips K.Hitti.History Of The Arabs. P.3

[12] سلیمان ندوی، مولانا۔ تاریخ القرآن، ص:77۔

[13] قرطبی، محمد بن احمد بن ابی بکر، امام۔ الجامع لاحکام القرآن:1/68۔ ت: احمد البردونی وابراہیم اطفیش۔ دار الکتب المصریۃ، قاصرہ۔ ط:2، 1964م

[14] سیوطی، عبد الرحمن، جلال الدین، امام۔ التحبیر فی علم التفسیر، ص:89۔ دار الفکر، بیروت لبنان۔ ط:2001ء

[15] قرطبی، محمد بن احمد بن ابی بکر، امام۔ الجامع لاحکام القرآن:1/68۔ ت: احمد البردونی وابراہیم اطفیش۔ دار الکتب المصریۃ، قاصرہ۔ ط:2، 1964م

[16] حافظ زبیر، ڈاکٹر۔ اسلام اور مستشرقین، ص:83۔ مکتبہ رحمۃ اللعالمین، لاہور۔ ط:2014ء